*Article*

# URDU POETRY IN ECOLOGICAL CONTEXT

## ماحولیات (Ecology) کے تناظر میں اُردو شاعری

**Dr. Tahira Siddiqa*[1],Dr. Muhammad Naveed[2]**

[1] Assistant Professor,Department of Urdu , Kinnaird College For Women University, Lahore
[2] Head of Urdu and Regional Languages Department, Karakoram International University, Gilgit Baltistan.
*Correspondence: siddiqatahira@tahoo.com

[1] ڈاکٹر طاہرہ صدیقہ، ڈاکٹر محمد نوید[2]

[1] اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، کنئیرڈ کالج فار ویمن یونیورسٹی، لاہور، [2]صدر شعبہ اردو و علاقائی زبانیں، قراقرانٹر نیشنل یونیورسٹی، گلگت بلتستان

**Abstract:** Ecological movement has impacted political, social and cultural life as well as literature also. In this article, special study of Urdu poetry in respect of effects of ecology movement has been presented in terms of different factors. Like literature of the languages of rest of the world, Urdu literature also records protest against the devestation caused due to lost nature, industrial andtechnological advancement.
If we look at the early forms of Urdu poetry, it is known that the style of feeling which was created by the aesthetics of the Bahmani period in the Deccani poetry continued in the Qutb Shahi period and then continued its journey to the Vali Deccani. Remains. The dominance of the linguistic, cultural and aesthetic style of feeling formed by earthly experience is seen overshadowing the entire Deccani literature.

**Keywords**: Ecology, Literature, Urdu poetry, Silent Spring" Industrialization and economical advancements, Rachel Carson.

**eISSN**: 2073-3674
**pISSN**: 1991-7813
Received:01-06-2023
Accepted:25-06-2023
Online:30-06-2023

**Copyright:** © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ماحولیات کی تحریک انیسویں صدی کے نصف آخر میں شروع ہوئی۔ جرمن معاشیاتی مفکّروں نے بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں اس موضوع سے بڑی دلچسپی لی۔ کسی بھی فلسفے یا تحریک کے اثرات لازماً سوشل سائنسز پر مرتب ہوتے ہیں اوراس فلسفے یا تحریک کے اثرات سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی کے ساتھ ساتھ لازماً ادب پر بھی پڑتے ہیں۔ ماحولیات اور معاشیات میں ہمیشہ گہرا ربط رہا ہے، اسی طرح ادب سے بھی اس کا گہرا تعلق ہے۔ ماحول کی آلودگی سے پیدا ہونے والے جُملہ مسائل سے جہاں زندگی کے دیگر شعبے متاثر ہوئے وہیں ادیب اور شاعر بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ سائنسدانوں نے اس ضمن میں جو اقدامات کیے، سو کیے مگر انگریزی ہو یا اُردو ادب فطرت کو مسخ کرنے اور مشینی و صنعتی ترقی کے باعث پیدا ہونے والی تباہ کاریوں کے خلاف احتجاج اور شکایت ملتی ہے۔ ماحولیات کے حوالے سے خدشات ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان بہت بڑھ گئے تھے اور اب یوں لگتا ہے کہ ان تاریک پیش گوئیوں کے پُورا کرنے کا وقت قریب آپہنچا ہے۔

لفظ ایکالوجی (Ecology) کو قدرتی ماحول یا ماحولیات کے مترادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ایکالوجی یا ایکالوجیکل سائنس جانداروں کی بہتات، گروہ بندی اور اس کے نتیجے میں جانداروں کے آپس میں اور اُن کے ماحول پر اثر انداز ہونے کے سائنسی مُطالعے کا نام ہے۔ جانداروں کے ماحول میں اُن کی جسمانی خصوصیات کے علاوہ کچھ اور چیزیں جیسا کہ سُورج کی روشنی، آب و ہوا، جغرافیائی حالات بھی ہوتے ہیں، جنھیں تمام جاندار یکساں طور پر حاصل کرتے ہیں۔

ماحولیات کی تحریک کے پس منظر میں رُومانی تحریک کارفرما تھی، جس کے نمایاں خدوخال میں علاوہ دیگر عناصر کے ساتھ جبلّی طرزِ عمل اور غیر متمدن فطری زندگی کی جانب مراجعت یعنی فطرت کی طرف واپسی، فطرت پسندی اور تخیل کی فراوانی بھی اہم ہیں۔ تمام رومانویت پسندوں کے نزدیک فطرت محض ایک خارجی اور بے حس میکانی شے نہیں بلکہ زندگی کی نامیاتی وحدت کا ایک حصّہ ہے اور یہ بھی انسان کی طرح جمالیاتی اور خیر کی اقدار کا حامل ہے۔ اس حیثیت سے فطرت براہ راست حسّاس روحوں سے ہم کلام ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

کائنات اور فطرت کو مسلّسل بڑھوتری اور نمو پذیری کے باعث درخت سے مُشابہ سمجھا جاتا ہے۔ قدیم دور میں فطری پہلو غالب تھا۔ درختوں کے سبز پتوں کو اوراق سمجھا جاتا تھا، جن پر معرفت کی حکایات رقم تھیں۔ یہ نمو کی علامتیں اور شادابیوں کے استعارے تھے۔ صاف سُتھری آب و ہوا اور آلائشوں سے پاک ماحول تھا۔ خالص غذا، شفاف ماحول، دیہی زندگی کا حُسن اور اس صاف ستھرے ماحول کے اثر کے تحت پیدا ہونے والی سادہ، پُر خلوص، بے ریا محبت اور انسانی قُربت تھی۔ وہ دیہی ماحول، فطرت کے دل کش مناظر، درخت، سبزہ، جنگل اور پرندوں کے چہچہانے کی انتہائی خوب صورت آوازیں جو درختوں اور جھاڑیوں کے جُھنڈ سے آتی تھیں، وہ خاموشی اور صرف ایک چکّی یا رہٹ کی آواز کا سُنائی دینا رفتہ رفتہ خواب ہوتا جارہا ہے۔ دیہات اُجڑتے اور شہر آباد ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ اب بڑے بڑے شہروں میں مصروف شاہراہوں پر بے تحاشا دُھواں اُگلتی ہوئی گاڑیاں، فیکٹریوں، کارخانوں اور مِلّوں کی چمنیوں اے خارج ہوتا ہوا دُھواں اور فالتو مواد کا سمندروں اور دریاؤں میں پھینکا جانا نہ صرف اِرد گرد کے ماحول اور فطرت کی تباہی کا باعث بنتا جارہا ہے

بلکہ انسانوں کی صحت کے لیے بھی مُضر ہے۔ شہروں کی فضا میں اس قدر آلودگی اور شور ہے کہ اس سے کئی طرح کی بیماریاں پھیل رہی ہیں ۔جنگلات کٹ رہے ہیں۔ زمین پر رہنے والوں اور خود زمین کا سانس لینا دُشوار ہوتا جارہا ہے۔

ماحولیاتی مسائل کی جانب توجہ مبذول کرانے اور جراثیم کش ادویات بنانے والی کمپنیوں کی تجارتی حرِص نباتاتی، حیوانی اور انسانی زندگی کو جو نقصان پہنچا رہی تھیں، اسے بے نقاب کرنے میں امریکی خاتون ریچل کارسن (Rachel Carson) کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان کی کتاب سائلنٹ سپرنگ (Silent Spring, 1962) نے دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ مصنفہ نے ۱۷ ابواب پر مشتمل اپنی کتاب میں دلائل وشواہد سے ثابت کیا کہ بعض جراثیم کش ادویات جیسے ڈی ڈی ٹی، تمبا کو کہیں زیادہ زہریلی ہیں۔ ان ادویات کی تیاری میں کمپنیاں احتیاط سے کام نہیں لیتیں کیونکہ اُنھیں زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے سوا کسی بات سے غرض نہیں ہوتی۔ الگور (Al Gore) اس کتاب کے تعارف میں تحریر کرتے ہیں کہ اس کتاب کے ذریعے مصنفہ نے اس بات کو ناقابلِ تردید طریق سے ثابت کیا ہے کہ ادیب کا خیال سیاست دان کی طاقت سے کہیں بڑا ہوتا ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

''…..this book,the Environmental movement might have been long delayed or neverhave developed at all."(1)

اس کتاب کی اشاعت کے بعد ماحولیات پر بڑی سنجیدگی سے توجہ دی جانے لگی۔ ماحولیات کے بنیادی مقاصد میں یہ پتا چلانا کہ نباتات، حیوانات اور خود انسانوں کے لیے کس قسم کا ماحول ساز گار ہے، صنعتی ترقی کے جوش میں ہم کس طرح اپنے ماحول کو تباہ کر رہے ہیں اور اس کے تحفظ کے لیے کیا اقدامات کیے جانے چاہیں، شامل ہیں۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی، فضائی اور آبی آلودگی، عالمی درجہ حرارت میں اضافہ، اوزون کی پرت میں شگاف، یہ سب مسائل فوری توجہ کے طالب ہیں۔

پاکستان میں ماحولیاتی آلودگی کی صورتحال بہت ابتر ہے۔ حکومت۔ صنعتی اداروں اور خود لوگوں کو مطلق پروا نہیں کہ وہ کس تیزی سے تباہی کی جانب بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"اس ضمن میں فقط آرائشی لیپا پوتی سے کام لیا جارہا ہے۔ ان مسائل سے بظاہر ادب کا کوئی براہ راست تعلق نظر نہیں آتا لیکن ماحولیاتی تباہی بالآخر خود ادب کی موت ثابت ہو سکتی ہے۔"(۲)

ڈبلیو۔بی یٹس (W.B Yeats) اپنی ایک نظم میں جھیل کنارے کُٹیا بنا کر رہنے کی آرزو کرتا ہے۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس (D.H. Lawrence) صنعتی تہذیب کو تج کر میکسیکو اور نہ جانے کہاں کہاں سکون کی تلاش میں بھٹکتا پھرا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ خواہش اور یہ سب تج کر فطرت کی جانب لوٹنے کی خواہش آخر بار بار انسان کو کیوں ستاتی ہے؟ رومانی فرار کا سادہ تصور اپنی جگہ مگر وہ بھی تو نفسیاتی اور روحانی ضرورتوں ہی کا مظہر ہے۔ لیکن عام سطح کے روحانی فرار سے آگے کئی پیچیدہ مراحل ہیں، جن کا انسان کے اندرون سے عجیب رشتہ ہے۔ Jon جان گورڈن (Jon Gordon) کا ناول دی کارپینٹر (The Carpenter) اسی رشتے کی وضاحت کرتا ہے۔ ایک موسیقار شب و روز کی اُکتاہٹ میں ایک قدیم ساز کی تلاش میں ایمزون کے جنگلات میں جانے والی مہم میں شامل ہوا۔ جنگل میں قبائلی زندگی نے اُسے رِجھالیا۔ جب وہ دوبارہ شہری زندگی کی جانب لوٹا تو اُسے بار بار جنگل کی پُکار لہو میں سرسراتی ہوئی محسوس ہوتی۔ وہ ایک بار

پھر جنگل کی طرف لوٹتا ہے مگر دریاؤں کے چڑھ جانے کی وجہ سے جنگل کی جانب واپسی ممکن نہیں ہو پاتی۔ معنویت سے پُر اس ناول کے ضمن میں ڈاکٹر سہیل احمد خان لکھتے ہیں:

"یہ سچ ہے کہ جنگل یا فطری حالت کی طرف اب انسان کی واپسی ممکن نہیں۔ وہ بس اس خواہش پر نظمیں یا ناول ہی لکھ سکتا ہے مگر اس کا کیا کیجیے کہ انسان کی ذات میں قدیم آبائی اور اجتماعی تجربات کا ایک گھنا جنگل موجود ہے اور اس سے رابطہ قائم کیے بغیر چارہ نہیں۔"(۳)

فطرت پر سائنس اور ٹیکنالوجی کی یلغار کے بعد اُس کے مادرانہ اور مُشفقانہ کردار کے خاتمے پر عالمی سطح پر شعرا و ادبا نے اندیشہ ہائے دُور دراز کے بیان میں ماحولیاتی مسائل پر آواز اُٹھائی۔ ولیم وڈزورتھ (William Wordsworth) کی نظم نٹنگ (Nutting) اس کی نمایاں اور اہم مثال ہے۔ کارل کروبر (Karl krober) نے اپنی کتاب "Ecological literary criticism" میں اس حوالے سے لکھا ہے:

"Perhaps the most provocative expression of the moral difficulties of a proto.ecological attitude appears in wordsworth's poem Nutting."(4)

اُردو ادب میں قرۃ العین حیدر کے یہاں فطرت کا بیان ملتا ہے۔ انتظار حسین کے ہاں فطرت کی گمشدگی کا ماتم، مجید امجد کا درختوں کے کٹنے کا نوحہ، ناصر کاظمی کے یہاں چڑیوں اور درختوں کو سلام، منیر نیازی کے ہاں کھوئی ہوئی جنت اور اُجڑی ہوئی بستیوں پر افسوس کا اظہار ملتا ہے۔ حسن منظر کی کہانی "زمین کا نوحہ" بھی سائنس فکشن کے اثر کے تحت ایک کابوسی ماحول اور تمثیلی سی فضا کے ذریعے زمین کا نوحہ سناتی ہے۔ یہ کہانی سائنس کے خلاف نہیں مگر بذاتِ خود سائنسدانوں کے اندیشوں کا ہی رُوپ ہے۔ اب حکومتیں اور سائنسدان بھی کھوکھلی رجائیت سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نئی ترقی پسندی بھی خواتین کی ہمدرد ہے (تانیثیت کی تحریک) اور ماحولیاتی تحریک سے رشتہ جوڑ رہی ہے۔ یہاں پھر زمانہ قدیم کی طرح عورت اور فطرت کو ایک ساتھ دیکھا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان لکھتے ہیں:

"سائنس کی فراہم کردہ آسائشوں سے انکار کس کو ہے مسئلہ طرزِ احساس کی تبدیلی کا ہے، روشن خیالی اور خِرد افروزی کے مفہوم کو انیسویں صدی کے سیاق و سباق سے الگ کر کے وسیع تر منظر میں سمجھنے کا ہے"۔(۵)

مادیت پرستی، جدید صنعتی نظام کی وجہ سے نہ صرف ماحول آلودہ ہوا ہے بلکہ کئی اور مسائل بھی پیدا ہوئے ہیں جیسا کہ معاشرتی سطح پر مشینی تہذیب کی ترقی کے نتیجہ میں تہذیبی اور اخلاقی زندگی میں انتشار اور زوال، ذات سے لے کر کائناتی تنہائی اور بیگانگی کے احساسات۔ بقول علامہ اقبالؔ:

؎ ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات (۶)

جدید دور کے انسان نے محبت جیسے عظیم انسانی رویے کو کھو دیا ہے اور اب وہ محبت کے حقیقی مفہوم اور اس کے لطیف احساسات اور تجربات سے محروم ہوتا جارہا ہے۔ یہ سب یقیناً ماحول سے انسان کے رشتے کے سبب ہے کہ ماحول کی آلودگی نے انسان کی فہم و فراست سے جینے کی اچھی اور مُستحسن اقدار کو گم کر دیا ہے۔ اس طرح ماحول کی آلودہ آب و ہوا میں نیکی کا پودا پھل پھول نہیں سکتا اور انسان کی دُنیا کسی بہتر زمانے کی نوید نہیں سُنا سکتی۔ جیلانی کامران اس حوالے سے اپنی کتاب "ہمارا ادبی اور فکری سفر۔" میں رقمطراز ہیں:

"ہمارے ادب کی گواہی صرف یہی ہے کہ ہمارا انسان بیمار ہوچکا ہے، ہمارا ماحول غیر انسانی ہے۔۔۔ماحول کی برائی نے انسان کی دُشواریوں اور مرض کو پیدا کیا ہے۔ اگر ماحول کی نئی صورت گری کی جائے تو انسان کی بہتری کا امکان بھی ظاہر ہو سکتا ہے۔"(۷)

دیگر ممالک کے شعری ادب کی مانند ہمارے یہاں کے شاعر بھی صنعتی نظام کے مشینی پہلو سے بالکل مطمئن نہ ہوئے۔ مذہب اور مادیت کی ٹکر سے بے اطمینانی کا احساس دائمی صورت اختیار کر تا رہا۔ اس مشینی و صنعتی نظام پر مشتمل موجود آلودہ ماحول اور اُس کے نتیجے میں انسان کی بے بسی کا نوحہ، اُجاڑ پن کا احساس، فکر کی پسپائی، شخصیت کی شکست وریخت، تہذیبی بحران اُردو کے شعرا کے یہاں مختلف صورتوں میں اظہار پاتا ہے۔ اس ضمن میں اُردو شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک دور تو وہ ہے کہ جس میں انسان فطرت سے بے پناہ متاثر تھا اور اُس کا یہ تصور تھا کہ کائنات اپنی مکمل ترین صورت میں انسان سے افضل اور برتر ہے۔ لہذا کائنات یا فطرت کو مقدّس سمجھا گیا۔ شعرا نے فطرت کو خدا کا مظہر سمجھا اور ہر منظر میں اُسی کا جلوہ دیکھا۔ یا پھر فطرت اور قدرتی مناظر اور ماحول کو سراہا اور اُس سے لطف اندوز ہوئے۔ فطری مناظر اور چاند، سُورج اور ستاروں کو اپنے محبوبِ ارضی یا سماوی کی علامت کے طور پر استعمال کیا۔ جبکہ دوسرا دور وہ ہے جو سائنسی ترقی کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ یہ اُردو شاعری میں سائنسی و عقلی دور ہے، جس سے بے پناہ صنعتی و مشینی ترقی اور مادیت پرستی کے دور میں پیدا ہونے والے بے شمار اخلاقی، باطنی اور ماحولیاتی سطح پر مسائل کا اظہار جدید شعرا کے یہاں مختلف رنگوں میں نظر آتا ہے۔

اُردو شاعری کی ابتدائی صورتوں کی جانب دیکھا جائے تو پعلوم ہوتا ہے کہ دکنی شاعری میں جو طرزِ احساس بہمنی دور کی جمالیات نے بنایا تھا، وہی طرزِ احساس قطب شاہی دور میں جاری و ساری ہے اور پھر ولی دکنی تک اس کا سفر جاری رہتا ہے۔ زمینی تجربے سے بننے والے لسانی، تہذیبی اور جمالیاتی طرزِ احساس کا غلبہ پورے دکنی ادب پر چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، نصرتی اور ولی یہ تمام شعرا اپنے زمینی و مقامی ماحول اور فطرت کے ساتھ منسلک تھے۔ وہ فطرت کو یا فطرت کے کسی مخصوص منظر یا پہلو کو عموماً حُسن اور عورت کے استعاروں، علامتوں اور تشبیہات کی شکل میں متشکل اور مجسّم دیکھتے تھے۔ میر تقی میر ایک ایسے دور میں زندہ تھے جہاں زندگی کی شکستوں کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ معاشرتی زوال کے ساتھ اعصابی شکست وریخت کا مسلسل عمل جاری تھا۔ میر کی شاعری میں علاوہ دیگر پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اپنے ماحول کی شکستگی اور اس کے اثرات کا اظہار جابجا ملتا ہے۔ مرزا غالب کی شاعری فکر و فلسفہ کی شاعری ہے۔ اُن کی شاعری میں بھی فطرت، حُسن، حُسن کے تماشے، مظاہر اور ہنگامے ملتے ہیں۔ سبزہ، ابر، ہوا، ویرانہ اور صحرا وغیرہ اُن کی علامتیں ہیں، جنھیں وہ اپنی حسّیت پرستی اور روایت شکنی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

بخشے ہے جلوۂ گُل ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا(۸)

عوامی شاعر نظیرؔ اکبر آبادی کی ساری شاعری نیرنگیٔ حیات اور کائنات کی تمثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ کائنات کے تمام جلووں میں وہ ذات حقیقی کے رنگ رُوپ کو دیکھتے اور ہر پُھول، پتی، پیڑ اور پودے میں وہ ذات باری کو شناخت کرتے تھے۔ علامہ اقبالؔ کی شاعری میں رومانوی عناصر کی نشاندہی اکثر ناقدین نے کی ہے۔ اُن کے ہاں رومانویت کا اولین اظہار مظاہرِ فطرت سے اُن کی وابستگی اور لگاؤ سے ہوتا ہے۔ اقبالؔ کے ہاں ابتدا سے ہی فطرت کا نامیاتی تصور کار فرما نظر آتا ہے۔ وہ فطرت اور اُس کے مظاہر کو بے جان اور خارجی نہیں سمجھتے بلکہ اسے زندگی کے عمل میں شریک خیال کرتے ہیں۔ اُن کے خیال میں فطرت کی ترکیب ہی اس طرح ہوئی ہے کہ اس میں مزید وُسعت کی گنجائش موجود ہے لہٰذا وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

"یہ کوئی جامد کائنات نہیں۔ نہ کوئی ایسا مصنوع جس کی تکمیل ہو چکی اور بے حرکت اور ناقابلِ تغیر و تبدل ہے۔ بر عکس اس کے معلوم ہوتا ہے اس کے باطن میں ایک نئی آفرینش کا خواب پوشیدہ ہے۔"(۹)

اقبالؔ جابجا مظاہرِ فطرت سے مخاطب ہوتے اور اُن سے کلام کرتے ہیں نیز اُنھیں انسانی خصوصیات سے مُتصف کرتے ہیں۔ جیسا کہ وہ ہمالہ کو محض ایک بے جان پہاڑی سلسلہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے انسانی تاریخ اور تہذیب و تمدن کے عروج و زوال کا رازدان گردانتے ہیں:

اے ہمالہ! داستاں اُس وقت کی کوئی سنا
مسکن آبائے انساں جب بنا دامن تیرا(۱۰)

"ہمالہ" ایک نئے انداز کی نظم ہے، جس میں پہلی بار فطرت کا ایک نیا اور زندہ تصور سامنے آیا جس کا ایک حصہ انسان ہے۔ یہ تصور اُردو میں اس سے قبل مُستعمل فطرت کے میکانی تصور سے بالکل مختلف ہے۔ اقبالؔ نے فطرت اور مظاہرِ فطرت کو ایک رواں دواں حقیقت کے طور پر دیکھا اور بیان کیا ہے۔ وہ انھیں اپنے فلسفیانہ نظام اور خیالات کی تشریح کے لیے بطور علامت استعمال ہی نہیں کرتے بلکہ ان سے بطور ایک ذی رُوح مخاطب بھی رہتے ہیں۔ شاہین، لالہ صحرائی، جُوئے بار اور روح ارضی وغیرہ اقبالؔ کے ہاں محض استعارے نہیں بلکہ حقیقت کی علامات بھی ہیں۔

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اُکسانے لگا مُرغِ چمن(۱۱)

بیسویں صدی کے جدید نظم گو شاعر مجید امجد کی شاعری کا نیا فکری حوالہ اُس وجودی انسان کا کرب معلوم ہوتا ہے جو زندگی کی میکانکی اقدار سے اُکتا چکا ہے۔ وہ زندگی کی میکانکی رفتار اور پھیلاؤ کے خلاف بھرپور ردّ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ چونکہ مجید امجد کا تعلق اپنی

دھرتی کے ساتھ نہایت گہرا ہے اس لیے وہ اپنے نئے فکری تناظر کی تشکیل کے لیے فطرت کی جانب رجوع کرتے ہیں اور اس کی آغوش میں پناہ تلاش کرتے ہیں۔ اُن کی نظم ''توسیع شہر'' میکانکی و تجارتی زندگی کے خلاف بھرپور ردّعمل کا اظہار اور فطرت سے انسانی تعلقات کو از سرِ نو استوار کرنے کے لیے اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار

جھومتے کھیتوں کی سرحد پر بانکے پہرے دار!

گھنے، سُہانے، چھاؤں چھڑکتے، بُور لدے چھتنار

بیس ہزار میں بِک گئے سارے ہرے بھرے اشجار (۱۲)

فطرت سے محبت اور لگاؤ کا رویہ مجید امجد کی شعری کائنات کا اہم حوالہ بنتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے فطرت اور مجید امجد ایک دوسرے کے لیے جزو لازم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عالمی تناظر کے حوالے سے دیکھا جائے تو آج کا ادب فطرت اور انسان کے تعلقات کی از سرِ نو تعمیر و تشکیل کر رہا ہے۔ صنعتی معاشرے کی ترقی نے ماحول اور فطرت کو جس قدر نقصان پہنچایا تھا آج کا انسان اس نقصان کی تلافی کر رہا ہے۔ سیّد عامر سہیل اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''مجید امجد کے یہاں فطرتی مظاہر ایک مکمل تخلیقی عمل سے گزر کر اس کی شاعری میں در آتے ہیں جس کی وجہ سے وہ مظاہر خود بولتے اور اپنے ماحول کا نوحہ سناتے محسوس ہوتے ہیں۔''(۱۳)

مجید امجد کی نظموں میں جدید مشینی تہذیب کی پیدا کردہ سحر کاریوں اور اس کے نتیجے میں اس کے ذہنی تشکیک اور محرومی کا اظہار ہوتا ہے۔ اُن کی نظم ''دُور کا پیڑ'' خوابوں اور تمناؤں کی علامت ہیں۔ جب وہ پھیلی ہوئی چراگاہوں اور ہانپتی پگڈنڈیوں سے گزر کر ان پیڑوں کے قریب آجاتی ہے تو وہاں شکستِ خواب کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مجید امجد اپنی زندگی اور اپنی شاعری میں کائنات کا علامتی رُوپ بن کر اُبھرے۔ جب کوئی درخت کٹتا ہے، کوئی چیونٹی پاؤں تلے آئی، کوئی پُھول مسلا گیا یا کوئی پرندہ، شخص یا کوئی مخصوص طبقہ ظلم کا نشانہ بنتا ہے تو وہ اس درد کو گہرائی سے محسوس کرتے ہیں۔ اُن کی نظم ''جیون دیس'' میں پیلے چہرے، ڈوبتے سورج، روحیں، گہری شامیں، سانس کی آخری سلوٹ، ڈولتی محرابیں اور ٹوٹتے فرش، اُکھڑتی اینٹیں اور گزرے دنوں کے ملبے ایسے امیجز ہیں جن میں ماضی کے مزار نظر آتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد زندگی میں تیز رفتاری آگئی اور سائنسی ایجادات اور صنعتی ترقی کی برکات سے انسانی معاشرہ بہرہ ور ہوا ہے۔ اس ترقی کے پیدا کردہ مسائل میں بے تحاشا بڑھتی ہوئی آبادی اور صنعتی ترقی کی بنا پر انسان اور اس کے فطری ماحول میں جو ہم آہنگی قائم تھی، رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی ہے۔ نئی شاعری بالخصوص نئی غزل میں زندگی سے گہرے طور پر مربوط ہونے کی وجہ سے ان مسائل کی عکاسی کرتی ہے۔ ناصرؔ کاظمی کی ابتدائی غزلوں میں فطرت کے مظاہر کی کیفیت یوں موجود ہے جیسے کسی قافلے نے تھوڑی دیر کے لیے پڑاؤ ڈالا ہو۔ ہجرت کے احساس کو مظاہر کی بے ثباتی کے ساتھ ملا کر ناصرؔ کاظمی نے جدید اُردو غزل کو ایک نئی معنوی جہت عطا کی

ہے۔اُنھوں نے فطرت کا ادراک تہذیبی اُجاڑ پن کے تقابل میں کیا۔ایک طرف شاخوں پر جلے ہوئے بسیرے اور ہجرت کرتے ہوئے طیور جبکہ دوسری جانب لُٹتے ہوئے قافلے اور خالی ہوتی ہوئی بستیاں۔اُن کا ایک شعر مُلاحظہ کیجیے:

خالی شاخیں بُلا رہی ہیں　　　　　پُھولو آؤ کہاں گئے ہو(۱۴)

ناصرؔ کاظمی نے ملول لہجے میں یہ کہا تھا کہ یہ شعر اُن ماؤں کا نوحہ ہے جن کی گودیں خالی ہو گئیں۔ناصرؔ کے یہاں چھوٹی چھوٹی تصویروں کو جوڑنے سے عہد کی ویرانی کی تصویر مکمل ہوتی ہے اور ایک ایسا شہر دکھائی دیتا ہے، جس میں اکیلے گھر، بند دروازے اور خالی رستے ہیں۔وہ فطرت سے رشتہ جوڑتے اور کبھی اپنی تنہائی اور اُداسی ہی کو مقدّس بنالیتے ہیں۔ناصرؔ کاظمی اپنے عہد کی ویرانی اور اُداسی کو آج کے انسان کا بھجن کہہ کر اسے ایک مقدّس حیثیت دیتے ہیں۔

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصرؔ　　　　　اُداسی بال کھولے سو رہی ہے(۱۵)

ناصرؔ کاظمی کی اُداسی زر پرست معاشرے کی حرِص سے خود کو علیحدہ کرنے کی کوشش ہے۔

اُڑ گئے شاخوں سے یہ کہہ کر طیور　　　　　اس گلستاں کی ہوا میں زہر ہے(۱۶)

منیر نیازی کے ہاں فطرت سے گہری شیفتگی کا احساس اور رومانی اُداسی دکھائی ہے۔"جنگل میں دھنک" میں شہری مناظر بھی فطرت کے مناظر کے ساتھ ساتھ آتے ہیں جیسا کہ خالی مکان میں ایک رات، جنگل میں زندگی، آدھی رات کا شہر وغیرہ۔"ماہ منیر" سے ایک مثال دیکھیں:

دل کچھ اور بھی سرد ہوا ہے شامِ شہر کی رونق دیکھ کر
کتنی ضیا بے سُود گئی شیشے کے لفظ جلانے میں(۱۷)

منیر نیازی نے اپنے شعری مجموعوں "جنگل میں دھنک"، "دشمنوں کے درمیان شام"، "تیز ہوا اور تنہا پُھول" میں جنگل سے وابستہ علامات کو بے حد خوب صورتی سے استعمال کیا ہے۔ آج کا انسان جس روحانی خوف اور نفسیاتی کرب کا شکار ہے، اس کے اظہار کے لیے چڑیل اور چیل جیسی علامات لے کر منیر نیازی نے اُنھیں ہم عصر انسان کی زندگی کے دُکھ، المیہ اور سب سے بڑھ کر خوف کی فن کارانہ انداز سے ترجمانی کی ہے۔ان کی نظم "ماضی" سے مثال کے طور پر ایک حصہ دیکھیے:

یہ باغ ان گنت خوشبوؤں، چہچہاتے پرندوں،
گھنیرے درختوں کی اک دل نشیں جلوہ گہ تھا
یہ چُپ چاپ سنگیں عمارت، تب اتنی پرانی نہیں تھی
مگر آج جس سمت دیکھو
نگاہوں کے کشکول میں
سُونے بام و در و سقف

سُوکھے درختوں سے جھڑ کر گرے زرد پتوں، چٹختی ہوئی ٹہنیوں کے
سِوا کچھ بھی نہیں ہے!(۱۸)

اختر الایمان اور اُن کی نسل نے ایک طرف فطرت پسندی، جمال پسندی، رومانویت، سیاسی آدرشوں، انقلابی نعروں اور دوسری جانب جنگ عظیم کی آتشیں دنیا، مفلسی اور بے کاری کے عفریت اور گرد و پیش کی بے یقینی کی فضاؤں میں اپنی پہچان کرائی ہے۔ اس ضمن میں اختر الایمان کی دو نظمیں "نیا شہر" اور "عہدِ وفا" قابلِ ذکر ہیں۔ اُنھوں نے اپنی نظموں میں فطرت سے اپنا گہرا ربط ظاہر کیا ہے۔ اُن کے ایک شعری مجموعے کا عنوان "زمین زمین" ہے۔ اس مجموعے کی بیشتر نظموں پر زمین کا درد حاوی ہے۔ اختر الایمان نے زمین کے درد کو اُس کرب کے مترادف قرار دیا ہے جو بحیثیت ایک فرد اُن کے اندر پیدا ہوتا رہتا ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ انسان زمین پر رہتے ہوئے بھی زمین پر نہیں رہتا۔ اعمال زمین پر رہ کر کرتا ہے مگر ان کا پھل آسمانوں میں جنت کی صورت میں تلاش کرتا ہے۔ اس لیے اُس کا زمین سے صحیح رابطہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ وہ اس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ اچھے شاعر کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ خدا کی بنائی ہوئی زمین سے محبت کرتا ہو اور اس بات پر کڑھتا بھی ہو کہ انسان اسے خوب صورت بنانے کے بجائے بد صورت بنا رہا ہے۔ اُن کی نظم "اپاہج گاڑی کا آدمی" سے ایک حصہ ملاحظہ کیجیے:

میں بکھرا ہوا آدمی ہوں
مری ذہنی بیماریوں کا سبب یہ زمیں ہے
میں اس دن سے ڈرتا ہوں جب برف ساری پگھل کر
اسے غرق کر دے!
نئے آسمانی حوادث
صفر میں بدل دیں!
یا آدمی اپنے اعمال سے خود
اسے ایک کہانی بنا دے!
زمیں شوریدہ پشتوں کی آماجگہ بن گئی ہے!(۱۹)

اُن کی ایک نظم "تنہائی میں" میں سُوکھی ببول جذبہ شکست کی علامت ہے۔ اپنی نظم "ارضِ ناکس" میں وہ زمین یعنی فطرت کے حُسن درختوں اور پھولوں اور خوب صورتی کا ذکر حُزنیہ انداز میں یوں کرتے ہیں:

زمین جو سب کا مامن ہے
یہ گویا ارضِ ناکس ہے
اسے قحبہ سمجھ کر لوگ استعمال کرتے ہیں

کوئی والی نہیں وارث نہیں اس کا (۲۰)

فضائی آلودگی کا مسئلہ اب سے پہلے کبھی اس طور پر نہیں اٹھا تھا، جیسا کہ آج ہے۔ سائنسی تحقیقات اور ایجادات کے لیے کیے جانے والے تجربات کی زد میں زمین و آسمان، بحر و بر سبھی آ گئے ہیں۔ نئی شاعری نے زندگی اور ماحول سے رشتہ استوار کیا ہے اور عام زندگی اور عام آدمی کے تجربات کو بھی اہمیت دی ہے۔ اس طرح اس کا رشتہ زندگی اور عوام سے زیادہ گہرا ہو گیا ہے۔ نئی شاعری نے نئی علامتیں بھی اپنے قریب کے ماحول سے اخذ کی ہیں۔ اس طور پر نئی شاعری کا تعلق اپنی زمین سے گہرا ہو گیا ہے۔ نئے شعرا نے زمین اور ماحول سے رشتہ استوار کرنے کے لیے اور نئے الفاظ کی تلاش میں سب سے پہلے فطرت کا مطالعہ کیا اور فطرت سے بہت سے الفاظ اخذ کیے۔ ان میں سے بعض نے علامتی حیثیت اختیار کر لی جیسے چاند، آسمان، جنگل، بیابان، پھول اور مختلف پرندے وغیرہ۔

حبیب جالب کے یہاں برگِ آوارہ ایک ایسی علامت ہے جسے کبھی شاعر اپنی ذات اور کبھی اپنے معاشرے کے لیے استعمال کرتا نظر آتا ہے۔ محبت کی اُجڑتی ہوئی بستی میں برگِ آوارہ کے علاوہ سُنسان گلیوں کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ ایک طرف شاعر کی یادوں کا سلسلہ اُنھیں بار بار تقسیمِ برصغیر سے قبل کی دنیا میں لے جاتا ہے اور دوسری جانب وہ زمانے کو بے درد قرار دیتے ہوئے سرمایہ داری نظام کو کوستے ہیں:

حسرت سی برستی ہے در و بام پہ ہر سُو
روتی ہوئی گلیاں ہیں سسکتے ہوئے گھر ہیں (۲۱)

سائنسی ترقی نے دیہی زندگی کے حُسن کو برباد کر کے رکھ دیا، معصومیت اور دیہی زندگی کی فراغت کے احساسات کا شہری زندگی کی کاروبار پرستی، شاطری اور بے ایمانی سے متصادم اور اذیت آشنا ہونے کو ندا فاضلی اور دیگر شعرا نے اپنی شاعری میں اُبھارا۔ ندا فاضلی کی نظموں میں دیگر موضوعات کے علاوہ دیہی زندگی کے حُسن، معصومیت کے شہری زندگی کی بھیڑ میں گمشدگی اور فطرت کے مظاہر کی ستائش کے ذریعے خدا تک رسائی کے موضوعات بھی ملتے ہیں۔ اُن کی نظم "خدا کا گھر نہیں کوئی" دیکھیے:

بہت پہلے ہمارے گاؤں کے اکثر بزرگوں نے
اسے دیکھا تھا
یہیں تھا وہ
یہیں بچوں کی آنکھوں میں
مہکتے سبز پیڑوں میں وہ رہتا تھا
ہواؤں میں مہکتا تھا
ندی کے ساتھ بہتا تھا
ہمارے پاس وہ آنکھیں کہاں ہیں

جو پہاڑی پر چمکتی بولتی آواز کو دیکھیں
ہمارے واسطے اب پھول ہنستے ہیں
نہ کونپل گنگناتی ہے
خاموش اندھیروں میں سنہرے گیت گاتی ہے
ہمارا عہد ماں کے پیٹ سے اندھا ہے بہرہ ہے
ہمارے آگے پیچھے موت کا تاریک پہرہ ہے(۲۲)

احمد مشتاق تمنا کے شاعر ہیں اور آلودگی اور کثافت پسند نہیں کرتے۔ فطرت چونکہ پاکیزہ اور شفاف ہے لہٰذا فطرت سے ان کا رشتہ بہت مضبوط ہے۔ وہ دل کی پاکیزگی اور لطافت کو ہر صورت قائم رکھنا چاہتے ہیں مگر آج دھویں سے آسمان کا رنگ پیلا بلکہ سیاہ ہوتا جارہا ہے اور کارِ دنیا سے آلودہ ہو کر دل کی دنیا، تمناؤں اور خوابوں کی دنیا کچھ بجھ سی گئی ہے۔

دلوں کی اور دھواں سا دکھائی دیتا ہے
یہ شہر تو مجھے جلتا دکھائی دیتا ہے (۲۳)

اُردو کے اکثر و بیشتر شعرا نے جنگلات کے کٹنے اور اس عظیم ورثے کی بربادی پر اظہارِ تاسف کیا ہے۔ گو کہ بنیادی طور پر اس مسئلے کا تعلق ماحولیاتی سائنس سے ہے لیکن اس قسم کے اکثر اشعار کا سوز و گداز ان کی شعریت کا ضامن بن گیا ہے اور ان میں سے بعض شعروں میں ایک علامتی بُعد بھی موجود ہے۔ اگر ایک طرف جنگل فطرت کے حُسن اور فیاضی کا استعارہ ہیں تو دوسری جانب جنگلات کا کٹنا تہذیبِ حاضر کی مادیت پرستی اور بے حسی کا مظہر ہے۔

عہدِ جدید میں انسانی صورت حال لامعنویت، تشویش، کشمکش، انتشار اور بے چینی کے رویوں سے معمور ہے۔ سیاسی، معاشی اور اخلاقی جبریت کے نتیجے میں جنم لینے والے معروضی اور موضوعی ظلم و تشدد، ہوسِ زر، اقتدار کی جنگ اور فرسودہ روایات کا شکار ہے۔ شاعر کس طرح اس تمام صورت حال سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ کاروباری، میکانکی، ماحولیاتی آلودگی کے شکار اور غلامی کے ادراک کے پروردہ شاعر تنہائی، اجنبیت، خوف و اذیت کے تجربات کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں نیز اپنے ماحول کی پراگندگی، گھٹن، میکانکیت، افراتفری اور ظلم و استحصال کی جبریت کے خلاف احتجاجی رویہ اختیار کرتے ہیں۔ شاعر سماجی و عصری مسائل کی داخلی تفتیش سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے اپنے اردگرد کی صورتحال کی تبدیلی و بہتری کے لیے عزم و ہمت کے جذبات سے معمور دکھائی دیتے ہیں۔

ابتدا میں انسان کا فطرت کے حوالے سے جو نظریہ تھا، وہ فطرت کو برتر اور مقدّس سمجھنے کا نظریہ تھا۔ سائنسی دور آنے سے فطرت کی پُوجا اور انسان کی کم تری کا تصور ختم یا تبدیل ہوا۔ بیسویں صدی کے فلسفوں جیسے وجودیت وغیرہ میں انسان کو بہت بلند مقام دے دیا گیا کہ وہ فطرت کے تابع نہیں ہے بلکہ حاکم ہے اور جیسے چاہے فطرت کو اپنے تابع کر سکتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے کہا تھا:

انسان عظیم ہے خدایا اس نے تجھے عظیم بنایا(۲۴)

یہ اُس دور کا ماٹو تھا۔ مارکسزم اور سائنس ایک دوسرے کے کتنے ہی خلاف کیوں نہ ہوں اس معاملے میں اکٹھے تھے۔ ماحولیات اس بات پر زور دیتی ہے کہ انسان اکیلا حاکم نہیں ہے، وہ جس ماحولیاتی تناظر کا حصہ ہے اس کے حساب سے وہ اس نظام کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے، اس سے جُدا نہیں ہے۔ جانوروں، پرندوں، درختوں، ستاروں یا سیاروں کی دنیا سے گہرا ربط رکھتے ہوئے ہی انسان کوئی توازن حاصل کر سکتا ہے، یلغار کے ذریعے نہیں۔ شاید بلکہ یقیناً کائنات اس یلغار کے نتیجے میں ٹوٹ جائے جیسے اووزون کے غلاف میں شگاف، گرم موسم پھیلتے اور سرد موسم سُکڑتے جا رہے ہیں۔ لہٰذا فطرت اور فطری ماحول کے ساتھ منسلک رہنے کی ضرورت ہے اور پرندوں، درختوں، دریاؤں، پھولوں اور جنگلوں سے بھی تعلق رکھنا چاہیے۔

ماحولیات کا دوسرا پہلو سیاسی صورت میں ظاہر ہوا۔ بعض یورپی ممالک میں سیاسی پارٹیاں قائم ہو چکی ہیں، انھیں گرین پیس پارٹی (Green peace party) کا نام دیا گیا ہے۔ وہ صرف اس بنیاد پر پارلیمنٹ میں کوئی اہم عہدہ یا وزارت حاصل کر لیتے ہیں کہ اگر برسر اقتدار آئے تو ماحولیات پر توجہ دیں گے۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ اب ماحولیات پر ساری دنیا کی توجہ مرکوز ہو چکی ہے۔ ماحولیات بچاؤ، جنگلی حیات کے بچاؤ کی تحریکیں وجود میں آ چکی ہیں۔ شجر کاری مہموں کا انعقاد کیا جا رہا ہے۔ شاہراہوں پر بھی پھول پودے لگائے جا رہے ہیں۔ لوگوں کو سرسبز و شاداب ماحول کی جانب راغب کیا جا رہا ہے۔ ٹریفک پولیس کی جانب سے احکامات نافذ ہوتے ہیں کہ "ہارن نہ بجائیں" تاکہ ماحول سے شور کی آلودگی میں کمی لائی جا سکے، دھواں چھوڑنے والی گاڑیوں پر پابندی لگائی جاتی ہے۔ نایاب قسم کے جانوروں اور پرندوں کے شکار پر پابندی لگا دی گئی ہے تاکہ دنیا سے ان کے وجود کے خاتمے کو روکا جا سکے۔ بعض ممالک میں جانوروں کی کھالوں سے تیار کردہ ملبوسات پر پابندی لگا دی گئی ہے کیونکہ ان کے حصول اور تیاری کے لیے جانوروں کو قتل کیا جاتا ہے اور اس سے ان جانوروں کی نسل کی معدومیت کا اندیشہ ہے۔ اُجڑی ہوئی بستیوں کی بحالی اور تعمیرِ نو پر زور دیا جا رہا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں نے ماحولیات کے ضمن میں سائنسدانوں سے زیادہ کام کیا ہے۔ اُنھوں نے اس سلسلے میں آواز اٹھائی اور زبردست احتجاج کرتے ہوئے فطرت کے ساتھ انسان کے تعلق پر زور دیا۔ لہٰذا ادب میں ماحولیات کا موضوع بے حد اہم ہے۔

ماحولیات کی تحریک سے جہاں مثبت تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں ایک منفی پہلو بھی ذہن میں آتا ہے، اور وہ یہ کہ انسان کا فطرت اور اپنی دھرتی کے ساتھ اس قدر محبت اور عقیدت کا رویہ دیکھتے ہوئے یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ کہیں دھرتی پُوجا نہ شروع ہو جائے۔ جیسا کہ پاکستان میں ارضی و ثقافتی تحریک کی مثال دی جا سکتی ہے۔ اس تحریک نے اقبالؔ سے یہ نظریہ اکتساب کیا کہ ثقافت اور اس کا مظہر ادب، زمین اور آسمان کے رشتوں سے متشکل ہوتا ہے اور ترقی پسند تحریک سے اس حقیقت کو اخذ کیا کہ تخلیق میں زمین بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید رقمطراز ہیں:

> "پاکستان اور بھارت کی گزشتہ دو جنگوں نے اس تحریک کے ارضی اور روحانی تصور کو مزید تقویت دی۔ ان جنگوں کے بعد حب الوطنی اورارض پاکستان سے روحانی وابستگی کا جذبہ شدت سے پیدا

ہوا۔ اس کی ایک صورت تو "سوہنی دھرتی" کے تصور میں اُبھری اور دوسری صورت یہ ہوئی کہ شہروں اور قصبوں سے جذباتی وابستگی کا شدید ترین جذبہ پیدا ہو گیا۔ تیسرے شعرا نے نظریاتی تعصّب سے بلند ہو کر ارض وطن کی خوشبو کو جبلّی طور پر محسوس کیا اور اپنے گردوپیش کو شعری اظہار کے ساتھ منسلک کر دیا۔ چنانچہ زمین کی خوشبو نہ صرف شاعری میں رچ بس گئی بلکہ یہ قاری کے مشامِ جان کو بھی معطّر کرنے لگی۔"(۲۵)

اسی طرح میراجی کی نظمیں بھی دھرتی پُوجا کی ایک انوکھی مثال پیش کرتی ہیں۔ دھرتی پُوجا کے اس رجحان کی جڑیں میراجی کی اپنی روح کی گہرائیوں میں بہت اندر تک اُتری ہوئی تھیں، ورنہ یہ رُجحان اس شدّت اور زور کے ساتھ کبھی ظاہر نہ ہوتا۔ کچھ اور نئے شعرا کے یہاں بھی اسی قسم کے رُجحان کی عکاسی ملتی ہے۔

مختصر یہ کہ اُردو شاعری میں ماحول کو آلودگی اور پراگندگی سے بچانے اور فطرت کی جانب واپسی کے ضمن میں بہت عمدہ اور احتجاج پر مبنی کلام ملتا ہے۔ جس میں دیہی زندگی کے حُسن اور فطرت کے پاکیزہ ماحول کو یاد کیا گیا ہے اور درختوں اور جنگلات کو فطرت کے حُسن اور فیاضی کا استعارہ قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ فطرت کی جانب واپسی اب قدیم دور کی مانند ممکن نہیں۔ سائنسی و صنعتی ترقی نے ہر شے پر طبع آزمائی کرتے ہوئے جہاں پُر آسائش زندگی کی جدید سہولیات انسان اور جدید دنیا کو مہیّا کی ہیں، وہیں ماحول کو اس قدر آلودہ کر دیا ہے کہ اب اس صورتحال پر قابو پانا ایک مشکل مرحلہ ہے مگر ناممکن تو نہیں۔ اب اس ضمن میں کوششیں کی جارہی ہیں تو اُمیدِ واثق ہے کہ کچھ نہ کچھ بہتری ضرور ہی آئے گی۔ اور کچھ نہیں تو شاعر اور ادیب تو ماضی کی خوشگواریت کو یاد کر کے خوش ہو ہی سکتے ہیں اور فطرت کے ساتھ انسان کے تعلق کی گہرائی کا اظہار تو کر ہی سکتے ہیں۔ یہ اُمید کہ ماحول میں بہتری آئے گی، بر قرار رہنی چاہیے کہ اچھّی اُمید بسا اوقات بہترین نتائج سامنے لاتی ہے۔

----------

# حوالہ جات


۱۔ **برقی ماخذ:** https:\\clinttonwhitehouse4.archives.gov\WH\EOP\OVP\24 hours\carson.htmlمورخہ ۲۲دسمبر ۲۰۲۲۔

۲۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، محمد سلیم الرحمن، **منتخب ادبی اصطلاحات**، لاہور: شعبہ اُردو جی سی یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء، ص ۷۲

۳۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، **سیر بین**، لاہور: قوسین، بارِ اول، ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۲۔۱۰۱

۴۔ 4. https:\\www.ecobooks.com\books\ecoliter.ht, مورخہ ۲۲دسمبر ۲۰۲۲

۵۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، **تعبیریں**، لاہور: الرزاق پبلی کیشنز، اشاعت اول، اپریل ۲۰۰۰ء، ص ۹

۶۔ **محمد اقبال، لینن (خدا کے حضور) مشمولہ بال جبریل، لاہور: تاج کمپنی لیمیٹڈ، ۱۹۳۵ء،** ص ۱۷۴

۷۔ جیلانی کامران، **ہمارا ادبی اور فکری سفر**، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، طبع اول، ۱۹۸۷ء، ص ۱۵۲

۸۔ **غالب، اسد اللہ خان، دیوان غالب جدید (المعروف نسخہ حمیدیہ)، بھوپال: مدھیہ اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۲، ص ۱۹۷**

۹۔ اقبال، **تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ**، (مترجم)، سید نذیر نیازی، لاہور: بزم اقبال، ۱۹۵۸ء، ص ۱۶

۱۰۔ **محمد اقبال، ہمالہ، مشمولہ؛ کلیات اقبال، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، س ن، ص: ۱۹۷**

۱۱۔ **محمد اقبال، بال جبریل، لاہور: تاک کمپنی، ۱۹۳۵، ص ۹۸**

۱۲۔ مجید امجد، توسیع شہر، مشمولہ؛ کلیات مجید امجد، نئی دہلی، فرید ڈپو، ۲۰۱۱

۱۳۔ عامر سہیل، سیّد۔ **مجید امجد بیاضِ آرزو بکف**۔ ملتان: بیکن بکس گلگشت، بار اوّل، ۱۹۹۵ء، ص ۲۰

۱۴۔ ناصر کاظمی، دیوان، لاہور: فضل حق، ۱۹۹۲، ص ۳۵۲

۱۵۔ ایضا۔۔۔ ایضا۔۔۔ ص ۱۳۷

۱۶۔ ایضاً۔۔۔ایضاً۔۔۔ص ۸۷

۱۷۔ منیر نیازی، ماہ منیر، لاہور: مکتبہ منیر، س ن، ۷۵

۱۸۔ منیر نیازی، جنگل میں دھنک، لاہور: ماورا بکس، ۱۹۹۳، ص ۱۲

۱۹۔ اختر الایمان، کلیات اختر الایمان، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۰۰، ص ۲۷۵

۲۰۔ ایضاً۔۔۔ایضاً۔۔۔ص ۸۹

۲۱۔ حبیب جالب، برگ آوارہ، لاہور: مکتبہ کارواں، ۳۲۱

۲۲۔ ندا فاضلی، شہر میں گاوں، دہلی: معیار پبلی کیشنز، ص ۳۲۱

۲۳۔ احمد مشتاق، کلیات احمد مشتاق، الہ آباد: شب خون، ۲۰۰۴، ص ۸۳

۲۴۔ احمد ندیم قاسمی، شعلہ گل، لاہور: ۱۹۵۰، ص ۸۷

۲۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، **اُردو ادب کی تحریکیں**، کراچی: انجمن ترقیٔ اردو، ۱۹۸۳ء، ص ۶۳۳